IQBAL REVIEW (64: 2)
(April – June 2023)
ISSN(p): 0021-0773
ISSN(e): 3006-9130

'خطاب بہ جوانان اسلام' میں تلمیحات اور اشارات – ایک مطالعہ

حسنین عباس

معاون ادبیات

ABSTRACT

In 1914, Allama Iqbal wrote the poem "*Khitaab ba Nau-Jawanan-e-Islam*" in response to an invitation from the annual meeting of the Old Boys Association of MAO College, Aligarh. This poem, part of Bang-e-Dra, urges Muslim youth to compare their current status with the achievements and grandeur of their ancestors. This short poem encapsulates the past, present and future of the Islamic world. Allama Iqbal encourages Muslim youth to learn from their glorious past, reflect on their current decline and strive for a better future. The poem references key historical symbols, such as the phrase "*Woh Kia Gardoon Tha*" indicating the peak of Muslim civilization, which even non-Muslim thinkers acknowledge. Allama Iqbal calls upon today's Muslim youth to recall that era and strive to reclaim it. The term "*Taj Sar-e-Dara*" refers to the ancient Persian powers that dominated the early Islamic era but were defeated by Muslims through their faith, character, and knowledge, spreading Islam's message across the world. Allama Iqbal's philosophy places significant emphasis on spiritual humility (*Fakr*), and his ideal figures, the *mard-e-momin* (true believer) and *mard-e-qalandar* (spiritual man), are embodiments of this quality. He reminds Muslim youth that their ancestors achieved greatness through adherence to divine commandments and the example of the Prophet Muhammad (PBUH), transforming the world's

superficial beauty into genuine moral values. Allama Iqbal expresses deep sorrow over the lost intellectual heritage of Muslims, which today's youth neither possess nor realize has been appropriated by others. During his time in Europe, Iqbal observed firsthand how Western scholars benefited from the scientific and intellectual contributions of Muslim civilization, while the Muslim world and its youth remained oblivious to their own rich legacy. This, Iqbal laments, is a tragic irony of history.

Keywords:

خطاب بہ جوانان اسلام، کیا گردوں تھا، تاج سرداراں، نسل نو، مسلم سائنس، تمدن آفریں، الفقر فخری، علم کے موتی، اسلام تہذیب، مغربی تہذیب

علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے ملت اسلامیہ کے تنِ مردہ میں روح پھونکی۔ خصوصاً برصغیر کے مسلمانوں کی بیداری اور اجتماعی سطح پر ان میں بے عملی کے خاتمے کے لیے علامہ اقبال کی شاعری نے روح پرور عنصر کا کردار ادا کیا۔ اگرچہ علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں ملت اسلامیہ کے تمام طبقات کو اپنا مخاطب بنایا لیکن ان کی توجہ کا سب سے زیادہ مرکز نوجوان رہے۔ نوجوانوں کو خطاب کرتے ہوئے علامہ اقبال نے فارسی اور اردو میں کئی نظمیں لکھیں۔ بانگ درا کی نظم "خطاب بہ جوانان اسلام" اسی نوعیت کی ایک نظم ہے۔ نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے لکھی جانے والی نظموں میں یہ نظم نہ صرف بہت زیادہ مقبول ہوئی بلکہ مختصر ہونے کے باوجود نوجوانوں کو ان کے ماضی اور حال دونوں کا شعور دیتی ہے۔ اس نظم میں علامہ اقبال نے نوجوانوں کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا کہ وہ خواب غفلت سے بیدار ہوں اور اپنے حقیقی منصب کو پہچانیں کہ وہ کتنی عظیم تہذیب کے وارث ہیں۔ ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید یزدانی اس نظم کے تعارف میں لکھتے ہیں:

> اس نظم میں علامہ نے مسلم نوجوانوں کو اپنے اسلاف کے سوانح، عظمتوں اور دوسرے عظیم کارناموں سے اپنی حالت کا موازنہ اور مقابلہ کرنے کی دعوت دی ہے۔ اس دعوت میں ایک طرح سے انہیں عزم و عمل اور سعی و کوشش کا درس دیا گیا ہے۔ اس کی رغبت دلائی گئی ہے۔[1]

علامہ اقبال نے یہ نظم ۱۹۱۴ء میں اولڈ بوائز ایسوسی ایشن ایم، اے، او کالج علی گڑھ کے سالانہ اجلاس میں دعوتِ شمولیت کے جواب میں مولانا شوکت علی کے نام خط میں لکھی۔ علامہ اقبال نے اس اجلاس میں شمولیت سے معذرت کرتے ہوئے لکھا:

> بھائی شوکت! اقبال عزلت نشین ہے اس بدتمیزی کے زمانہ میں گھر کی چار دیواری کو کشتیٔ نوح سمجھتا ھے دنیا اور اھل دنیا کے ساتھ تھوڑا بہت تعلق ضرور ہے لیکن محض اس وجہ سے کہ روٹی کھانے کی مجبوری ہے۔ تم مجھے علی گڑھ بلاتے ہو میں ایک عرصہ سے خدا گڑھ میں رھتا ہوں اور اس مقام کی سیر کئی عمروں میں ختم نہیں ہو سکتی۔ علی گڑھ والوں سے میرا اسلام کہیے۔ مجھے اُن سے غائبانہ محبت ہے۔ اور اس قدر کہ ملاقات ظاہری سے اس میں کچھ اضافہ ہونے کا امکان بہت کم ہے۔ یہ چند اشعار میری طرف سے ان کی خدمت میں عرض کر دیجیے۔[2]

اس کے بعد خط میں علامہ اقبال نے نظم 'خطاب بہ جوانان اسلام' کے اشعار لکھ دیئے۔

غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

یہ ایک قطعہ ہے جو بعض دوسرے قطعات اور اشعار کے ساتھ ۱۹۱۴ء میں یعنی "شمع اور شاعر" کے دو سال بعد انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں پڑھا گیا تھا۔ اس سال جلسہ اسلامیہ کالج لاہور کے میدان میں حبیبیہ ہال کے عین سامنے منعقد ہوا تھا۔ اقبال نے اس کے لیے کوئی خاص نظم نہ لکھی تھی۔ آخری وقت میں انجمن کے کارکنوں کی طرف سے شدید اصرار ہوا تو متفرق چیزیں پڑھ دیں۔ ان میں ایک یہ قطعہ بھی تھا۔ گویا یہ "شمع اور شاعر" سے پہلے لکھا گیا۔ اگرچہ مدت بعد پڑھا گیا۔[۳]

یہ نظم مختصر ہونے کے باوجود ملت اسلامیہ کے ماضی، حال اور مستقبل کا احاطہ کرتی ہے۔ علامہ اقبال نے نوجوانان اسلام کو مائل بہ عمل کرنے کے لیے اس نظم میں انہیں ان کے شاندار ماضی سے روشناس کرایا ہے، حال کی بدترین حالت کا تذکرہ کیا ہے اور انہیں ایک شاندار اور بہترین مستقبل کی تعمیر کی ترغیب دی ہے۔ اس نظم کے اختصار کے باوجود علامہ اقبال کے پیغام کی جامعیت ان استعارات اور تلمیحات میں مضمر ہے جو اس نظم میں استعمال کی گئی ہیں۔ اس نظم کی تفہیم اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس میں موجود تلمیحات اور اشارات کو ان کے پس منظر اور معنوی گہرائی کے ساتھ نہ سمجھا جائے۔ یہاں اس نظم کی اہم تلمیحات واشارات کی وضاحت کی جاتی ہے:

۱۔ وہ کیا گردوں تھا

گردوں آسمان کو کہتے ہیں۔[۴] پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے گردوں سے مراد قوم لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "اے نوجواں! کبھی تو نے اس بات پر بھی غور کیا کہ تو جس قوم کا فرد ہے، وہ کسی زمانہ میں کس قدر عظیم الشان تھی؟"[۵] علامہ اقبال نے مسلم نوجوان کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ وہ عظمت و جلالت اور شان و شوکت پر مبنی اسلام کے سنہری دور کو یاد کرے۔ اسلام کے سنہری دور میں مسلمانوں کو علم و فضل کی بدولت بلند مقام حاصل تھا جس کا اعتراف غیر مسلم بھی کرتے ہیں۔ ایک غیر مسلم مؤرخ نے اِسی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے:

> The coming of Islam six hundred years after Christ, was the new, powerful impulse. It started as a local event, uncertain in its outcome; but once Muhammad conquered Makkah in 630 AD, it took the southern world by storm. In a hundred years, Islam conquered Alexandria, established a fabulous city of learning in Baghdad and thrust its frontier to the east beyond Isfahan in Persia. By 730 AD the

Muslim Empire reached from Spain and Southern France to the borders of China and India. An empire of spectacular strength and grace while Europe lapsed into the Dark Age .... Muhammad had been firm that Islam was not to be a religion of miracles, it became in intellectual content a pattern of contemplation and analysis.[6]

حضرت عیسیٰؑ کے چھ سو برس بعد اسلام کا ظہور ایک نئی توانا تحریک کے طور پر ہوا۔ اس کا آغاز ایک مقامی حیثیت سے ہوا، اور شروع میں نتائج کے اِعتبار سے صورتِ حال غیر یقینی تھی، مگر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۶۳۰ء میں جونہی فاتح بن کر مکہ میں داخل ہوئے تو دنیا کے جنوبی حصہ میں حیرت انگیز تبدیلی واقع ہوئی۔ ایک صدی کے اندر 'اسکندریہ' فتح ہوا، 'بغداد' اِسلامی علم و فضل کا شاندار مرکز بنا اور اسلامی حدوں کی وسعت مشرقی اِیران کے شہر 'اِصفہان' سے آگے نکل گئی۔ ۷۳۰ء تک اِسلامی سلطنت 'اندلس' اور 'جنوبی فرانس' کو سمیٹتی ہوئی 'چین' اور 'ہندوستان' کی سرحدوں تک جا پہنچی۔ طاقت اور وقار کی اس امتیازی شان کے ساتھ جہاں مسلم سلطنت اپنے عروج پر تھی وہاں یورپ اس وقت پستی اور تنزّل کے تاریک دَور سے گزر رہا تھا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اِسلام کو معجزات کے محدود دائرہ میں رکھنے کی بجائے اُسے غور و فکر اور تجزیہ کی نمایاں عقلی و فکری چھاپ عطا کی۔

کئی دیگر مغربی مصنفین نے بھی یہ حقیقت بیان کی ہے کہ مغرب کئی صدیوں بعد اس قابل ہوا کہ وہ مسلمانوں کی سائنسی تحقیقات کو کماحقہ سمجھ سکے اور اس سے استفادہ کر سکے:

Its golden age lasted some three centuries, from the ninth to the eleventh century, and it was only toward the end of that period (a little earlier in Spain) that the Latins became aware of the importance of Arabic science. They were fully aware of course of the material power of Islam, though it took two or three centuries of crusades to convince them of their own military inferiority. A nun of Gandersheim (in the duchy of Brunswick), HROSVITHA (X-2) spoke of CORDOVA the ornament of the world.[7]

مسلم سائنس کا سنہری زمانہ کم و بیش تین صدیوں، نویں صدی سے گیارہویں صدی تک جاری رہا۔ جب لاطینی عرب سائنس کی اہمیت سے شناسا ہوئے، اس وقت یہ سنہری دور خاتمے کے قریب تھا۔ وہ اسلام کی مادی طاقت سے مکمل طور پر آگاہ تھے۔ اگرچہ انہیں اپنی عسکری کمزوریوں کا ادراک دو تین صدیوں کی صلیبی جنگوں بعد ہوا۔ گیندر شیم کی ایک راہبہ نے قرطبہ کو دنیا کا زیور قرار دیا ہے۔

اولیں مغربی مترجمین اس قابل بھی نہ تھے کہ وہ مسلمانوں کی تصانیف کو پوری طرح اپنی زبانوں میں منتقل کر سکیں۔ جارج سارٹن نے لکھا ہے:

> The scientific tradition as it was poured from Arabic vessels into Latin ones was often perverted. The new translators did not have the advantage which the Arabic translators had enjoyed; the latter had been able to see Greek culture in the perspective of a thousand years or more; the Latin translators could not see the Arabic novelties from a sufficient distance, and they could not always choose intelligently between them. As to the Greek classics they came to them with a double prestige, Greek and Arabic. It is as if the Greek treasures, of which Latin scholars were now dimly conscious, were more valuable in their Arabic form; they had certainly become more glamorous. The translation of the Almagest made c. 1175 by Gerard of Cremona (XII-2) from the Arabic, superseded a translation made directly from the Greek in Sicily fifteen years earlier![8]

جب سائنسی روایت کو عربی کتب سے لاطینی کتب میں منتقل کیا جاتا تھا تو اکثر اسے بگاڑ دیا جاتا تھا۔ کیونکہ نئے مترجمین کو وہ سہولت حاصل نہیں تھی جو عربی مترجمین کو حاصل تھی۔ مؤخر الذکر ایک ہزار سال یا اس سے زیادہ مدت کے تناظر میں یونانی ثقافت کو دیکھنے کے قابل تھے۔ جبکہ لاطینی مترجم اتنے فاصلے سے عربی نزاکتوں اور ندرتوں کو نہیں دیکھ سکتے تھے، اور وہ کبھی بھی ان میں سے دانشمندانہ انتخاب نہیں کر سکتے تھے۔ یونانی کلاسیکی علوم ان کے پاس دوہرے معیار کے ساتھ آئے یعنی یونانی اور عربی۔ گویا یونانی علمی خزانے، جن کے بارے میں لاطینی علما اب خاموش ہو چکے تھے، اپنی عربی

شکل میں زیادہ قابل قدر تھے۔ وہ یقینی طور پر زیادہ پرکشش بن گئے تھے۔ ۱۱۷۵ء میں گیرارڈ نے المجستی کا عربی میں جو ترجمہ کیا وہ پندرہ سال قبل سسلی میں یونانی سے براہ راست کئے گئے ترجمے سے بہتر تھا۔

علامہ اقبال نے نوجوانوں کو اسلام کی اس عظمت رفتہ کی طرف متوجہ کیا ہے اور انہیں اس بات کی ترغیب دی ہے کہ وہ اپنی عظمت رفتہ کے حصول کے لیے تگ و دو کریں۔

۲۔ تاج سر دارا

تاج سرِ دارا سے مراد وہ عجمی طاقتیں ہیں جن کا اسلام کے ابتدائی دور میں دنیا پر غلبہ تھا لیکن مسلمانوں نے اپنے ایمان، کردار اور علم کی طاقت سے ان طاقتوں کو شکست فاش دی اور دنیا کو اسلام کے پیغام سے روشناس کروایا۔ علامہ اقبال نے اپنے کلام میں "دارا"[۹] اور "تاج سر دارا"[۱۰] دونوں اصطلاحات استعمال کی ہیں۔

اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں دارا کے ذیل میں لکھا ہے:

"دارا: (= داراب)، یہ اس ہخامنشی بادشاہ کے نام کی ایرانی صورتیں ہیں (عرب مصنفین نے بھی انہیں کو اختیار کیا ہے)، جو (یورپ میں) عام طور پر اپنی یونانی شکل داریوش Dareios (Darius) ہی میں لکھا جاتا ہے۔ داراب اور اس کا مخفف دارا براہ راست قدیم فارسی کے داریوہش سے لیے گئے ہیں۔"[۱۱]

دائرہ معارف میں مزید لکھا ہے:

المسعودی کا بیان بھی مختصر ہے۔ اس نے داریوش دوم اور داریوش سوم دونوں کو ایک ہی نام (دارا) سے یاد کیا ہے۔ الثعالبی: History of the Kings of the Persians (طبع و ترجمہ از Zotenberg، ص ۳۹۳ ببعد) میں بھی اس داراب کے اشتقاق کی ایسی ہی خیالی وجوہ درج ہیں۔ اس کا بیان الطبری کے بیان سے مماثل ہے اور اس میں بھی دارا کے کردار اور اسکندر کی منافقت کو وثوق سے بیان کیا گیا ہے۔[۱۲]

پروفیسر یوسف سلیم چشتی لکھتے ہیں:

دارا قدیم ایران کا مشہور بادشاہ جسے سکندر نے ۳۲۸ق م میں شکست دی تھی۔ تاج سر دارا سے مملکت ایران مراد ہے جسے مسلمانوں نے فاروق اعظم کے عہد خلافت میں فتح کیا تھا۔[۱۳]

حضرت نسیم امروہی فرہنگ اقبال میں لکھتے ہیں:

دارا: قدیم فارس (ایران) کے ایک مشہور بادشاہ کا نام جسے سکندر رومی نے شکست دی تھی۔[۱۴]

مسلمانوں کی افواج کا قدیم فارس کی عسکری اور تہذیبی پس منظر رکھنے والی ایرانی فوجوں سے کس طرح مقابلہ ہوا اور پھر کس طرح ان کی طاقت اور قوت کا غرور ٹوٹا، اس کی تفصیلات تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ ہم یہاں شبلی نعمانی کی کتاب "الفاروق" سے اس جنگ کے چند احوال بیان کرتے ہیں تاکہ یہ حقیقت واضح ہو سکے کہ جب مسلمانوں کا ایرانی افواج سے سامنا ہوا تو اس وقت دنیا کی ایک بڑی عالمی طاقت ہونے کے باوجود مسلمانوں نے جس ایمانی جرأت کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور انہیں شکست فاش سے دوچار کیا اس کی تفصیلات ہمارے سامنے آسکیں۔ شبلی نعمانی اپنی کتاب "الفاروق" میں ایران کے ساتھ ہونے والی جنگ کے احوال ان الفاظ میں لکھتے ہیں:

ساسانیوں کا پائے تخت قدیم زمانے میں اصطخر تھا لیکن نوشیروان نے مدائن کو دارالسلطنت قرار دیا تھا۔ اور اس وقت سے وہی پائے تخت چلا آرہا تھا۔ یہ مقام سعدؓ کی فرود گاہ یعنی قادسیہ سے ۳۰ - ۴۰ میل کے فاصلے پر تھا۔ سفراء گھوڑے اڑاتے ہوئے سیدھے مدائن پہنچے۔ راہ میں جدھر سے گزر ہوتا تھا تماشائیوں کی بھیڑ لگ جاتی تھی۔ یہاں تک کہ آستانہ سلطنت کے قریب پہنچ کر ٹھہرے۔ اگرچہ ان کی ظاہری صورت یہ تھی کہ گھوڑوں پر زین اور ہاتھوں میں ہتھیار تک نہ تھا۔ تاہم بے باکی اور دلیری ان کے چہروں سے ٹپکتی تھی۔ اور تماشائیوں پر اس کا اثر پڑتا تھا۔ گھوڑے جو سواری میں تھے, رانوں سے نکلے جاتے تھے اور بار بار زمین پر ٹاپ مارتے تھے، چنانچہ ٹاپوں کی آواز یزدگرد کے کان تک پہنچی اور اس نے دریافت کیا کہ یہ آواز کیسی ہے۔ معلوم ہوا کہ اسلام کے سفراء آئے ہیں۔ یہ سن کر بڑے سروسامان سے دربار سجایا اور سفراء کو طلب کیا۔ یہ لوگ عربی جبے پہنے کاندھوں پر یمنی چادریں ڈالے ہاتھوں میں کوڑے لیے موزے چڑھائے ہوئے دربار میں داخل ہوئے۔ پچھلے معرکوں نے تمام ایران میں عرب کی دھاک بٹھادی تھی۔ یزدگرد نے سفیروں کو اس شان سے دیکھا تو اس پر ایک ہیبت طاری ہوئی۔[۱۵]

شبلی نعمانی مزید لکھتے ہیں:

ایرانیوں کا ایک رسالہ سرتاپا لوہے میں غرق تھا۔ قبیلہ حمضہ نے اس پر حملہ کیا لیکن تلواریں زرہوں پر اچٹ اچٹ کر رہ گئیں۔ سردار قبیلہ نے للکارا۔ سب نے کہا زرہوں پر تلواریں کام نہیں دیتیں۔ اس نے غصے میں آکر ایک ایرانی پر برچھے کا وار کیا کہ کمر توڑ کر نکل گیا۔ یہ دیکھ کر اوروں کو بھی ہمت ہوئی اور اس بہادری سے لڑے کہ رسالہ کا رسالہ برباد ہو گیا۔

تمام رات ہنگامہ کارزار گرم رہا، لوگ لڑتے لڑتے تھک کر چور ہو گئے تھے اور نیند کے خمار میں ہاتھ پاؤں بیکار ہوئے جاتے تھے۔ اس پر بھی جب فتح وشکست کا فیصلہ نہ ہوا تو قعقاع نے سرداران قبائل میں سے چند نامور بہادر انتخاب کیے اور سپہ سالار فوج (رستم) کی طرف رخ کیا۔ ساتھ ہی قیس اشعث

عمرو معدی کرب، ابن ذی البردین نے جو اپنے قبیلے کے سردار تھے، ساتھیوں کو للکارا کہ دیکھو! یہ لوگ خدا کی راہ میں تم سے آگے نکلنے نہ پائیں اور اور سرداروں نے بھی جو بہادری کے ساتھ زبان آور بھی تھے، اپنے قبیلوں کے سامنے کھڑے ہو کر اس جوش سے تقریریں کیں کہ تمام لشکر میں ایک آگ لگ گئی۔ سوار گھوڑوں سے کود پڑے۔ اور تیر و کمان پھینک کر تلواریں گھسیٹ لیں۔ اس جوش کے ساتھ تمام فوج سیلاب کی طرح بڑھی اور فیرزان و ہرمزان کو دباتے ہوئے رستم کے قریب پہنچ گئی۔ رستم تخت پر بیٹھا فوج کو لڑا رہا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر تخت سے کود پڑا اور دیر تک مردانہ وار لڑتا رہا۔ جب زخموں سے بالکل چور ہو گیا تو بھاگ چلا۔ ہلال نامی ایک سپاہی نے تعاقب کیا۔ اتفاق سے ایک نہر سامنے آگئی۔ رستم کود پڑا کہ تیر کر نکل جائے۔ ساتھ ہی ہلال بھی کود ے اور ٹانگیں پکڑ کر باہر کھینچ لائے۔ پھر تلوار سے کام تمام کر دیا۔[۱۶]

۳۔ تمدن آفریں

اسلام کی آمد انسانیت کے لیے ایک نئے تمدن اور تہذیب کی آمد تھی۔ تاریخ گواہ ہے کہ انسانی تاریخ کی سب سے آخری اور مکمل تہذیب اسلام ہے۔ اسلام کے بعد کوئی بڑی تہذیب رونما نہیں ہو سکی۔ کیونکہ اسلام بطور تہذیب نہ صرف کامل و اکمل اور ایک مکمل رول ماڈل ہے بلکہ اس کی تعلیمات انسانیت نوازی کے لحاظ سے اس اعلیٰ تر معیار پر ہیں کہ ان سے بہتر انسانی اور تہذیبی اصولوں کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے اس نظم میں علامہ اقبال نے نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے ان کے آباء و اجداد کو تمدن آفریں قرار دیا۔ یہ وہ تمدن ہے جس کی بنیاد علمی اصولوں پر استوار ہے جو براہ راست قرآن حکیم اور سیرت نبوی سے ماخوذ ہے یعنی مسلمانوں نے انسانیت کو توہمات اور انسان دشمن رسوم و رواج کی جکڑ بندیوں سے آزاد کر کے انہیں تحقیق، علم اور شعور کی روشنی کی آشنا کیا۔ اس طرح انسانیت ایک ایسے تمدن سے آشنا ہوئی جہاں اب انسان مظاہر فطرت کی عبادت کرنے کے بجائے انہیں تسخیر کرنے کے راستے پر گامزن تھا۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کے زیر اثر ہی اپنے دور کی جاری روایات کے برعکس مسلمانوں نے حقیقی سائنسی انداز سے کائنات کا مطالعہ شروع کیا۔ مسلمانوں میں علمی اور سائنسی روایت کے آغاز میں قرآن حکیم کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے فلپ ہٹی (Philip K. Hitti) لکھتا ہے:

The attention and interest of the Moslem Arabs were drawn quite early to those branches of learning motivated by the religious impulse. The necessity of comprehending and explaining the Koran soon became the basis of intensive theological as well as linguistic study.[17]

بہت اوائل سے ہی مسلمان عربوں کی توجہ اور دلچسپی کا مرکز وہ علوم قرار پائے جن کے حصول کی ترغیب دین میں موجود تھی۔ قرآن حکیم کی تفہیم اور تشریح کی ضرورت جلد ہی وسیع مذہبی اور لسانیاتی مطالعہ کی بنیاد بن گئی۔

فلپ ہٹی (Philip K. Hitti) نے مسلمانوں میں علمی اور سائنسی رجحانات کے فروغ کو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کا فیضان قرار دیتے ہوئے لکھا:

Arab interest in the curative science found expression in the prophetic tradition that made science twofold: theology and medicine. The physician was at the same time metaphysician, philosopher and sage and the title Hakim was indifferently applied to him in all these capacities.[18]

علم الطب میں مسلمانوں کی دلچسپی کا سبب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث میں اس علم کا ذکر ہے۔ جس سے یہ علم دو نوعی اہمیت کا حامل ہو گیا: حکمت دین اور علم طب۔ ایک طبیب بیک وقت مابعد الطبعیات کا ماہر، فلسفی اور دانشور ہوتا تھا۔ اور 'حکیم' کے لقب کا اطلاق ان تمام حیثیتوں پر یکساں تھا۔

یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ عالم اسلام کی جملہ علمی و سائنسی اور ثقافتی ترقی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ کا ہی فیض ہے اور امت کی عظمت دراصل اسی کتابِ سیرت کا ہی ایک باب ہے۔ اسلام کا یہی فیضان بعد میں بقیہ دنیا میں منتقل ہوا اور انسانی شعور توہمات کی بجائے سائنسی اور تحقیقی انداز فکر کا خوگر ہوا۔ مغرب کا نامور مؤرخ اور محقق رابرٹ بریفالٹ (Robert Briffault) اس حقیقت کا یوں تذکرہ کرتا ہے:

It is highly probable that but for the Arabs, modern European civilisation would never arisen; it is certain that but for them character

which has enabled it to transcend all previous phases of evolution. For although there is not a single aspect of European growth in which the decisive influence of Islamic culture is not traceable, nowhere is it so clear and momentous as in the genesis of that power which constitutes the paramount distinctive force of the modern world and the supreme source of its victory, natural science and the scientific spirit. What we call science arose in Europe as a result of a new spirit of enquiry, of new methods of investigation, experiment, observation and measurement of the development of mathematics in a form unknown to the Greeks. That spirit and those methods were introduced into the European world by the Arabs.[19]

اس بات کا غالب امکان ہے کہ عرب مشاہیر سے خوشہ چینی کئے بغیر جدید یورپی تہذیب دورِ حاضر کا وہ اِرتقائی نقطہ عروج کبھی حاصل نہیں کر سکتی تھی جس پر وہ آج فائز ہے۔ یوں تو یورپی فکری نشوو نما کے ہر شعبے میں اسلامی ثقافت کا اثر نمایاں ہے لیکن سب سے نمایاں اثر یورپی تہذیب کے اُس مقتدِر شعبے میں ہے جسے ہم تسخیر فطرت اور سائنسی وجدان کا نام دیتے ہیں۔ یورپ کی سائنسی ترقی کو ہم جن عوامل کی وجہ سے پہچانتے ہیں وہ 'جستجو'، 'تحقیق'، 'تحقیقی ضابطے'، 'تجربات'، 'مشاہدات'، 'پیمائش' اور 'حسابی موشگافیاں' ہیں۔ یہ سب چیزیں نہ تو یورپ کو معلوم تھیں اور نہ یونانیوں کو، یہ سارے تحقیقی اور فکری عوامل عربوں کے ذریعے یورپ میں متعارف ہوئے۔

جوزف شاخت (Joseph Schacht) اسی حقیقت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

There is no doubt that the Islamic sciences exerted a great influence on the rise of European science; and in this Renaissance of knowledge in the west there was no single influence, but diverse ones; the main influence was of course, from Spain, then from Italy and Palestine through the crusaders, who had mixed with Muslims and seen the effect of sciences in Muslim culture.[20]

اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ یورپ کے سائنسی فکر پر اسلامی سائنسی فکر کا گہرا اثر مرتب ہوا۔ مغرب کی اِس علمی نشاۃِ ثانیہ پر دِیگر کئی اَثرات بھی مرتب ہوئے۔ مگر بنیادی طور پر سب سے گہرا اَثر اندلس (Spain) سے آیا، پھر اٹلی اور فلسطین کی جانب سے اَثرات مرتب ہوئے کیونکہ صلیبی جنگوں نے مغربی ممالک کے لوگوں کو فلسطینی مسلم ثقافت اور سائنسی اُسلوب سے رُوشناس کرایا۔

وِل ڈیورانٹ (Will Durant) نے مسلم تہذیب و ثقافت کے مغرب میں منتقلی کی تصریح کئی واقعات سے کی:

> The first paper-manufacturing plant in Islam was opened at Baghdad in 794 by Al-Fadl, son of Harun's Vezier. The craft was brought by the Arabs to Sicily and Spain, and there passed into Italy and France.[21]

اسلام کا پہلا کاغذ سازی کا پلانٹ ۷۹۴ء میں بغداد میں ہارون کے وزیر کے بیٹے الفضل نے لگایا۔ عرب یہ فن یہاں سے سسلی اور سپین لائے۔ اور یہاں سے یہ فن اٹلی اور فرانس منتقل ہوا۔

جارج سارٹن (George Sarton) لکھتا ہے:

> This illustrates the absurdity of trying to appraise mediaeval thought on the basis of Latin writings alone. For centuries the Latin scientific books hardly counted; they were out-of-date and outlandish. Arabic was the international language of science to a degree which had never been equalled by another language before (except Greek) and has never been repeated since. It was the language not of one people, one nation, one faith, but of many peoples, many nations, many faiths.[22]

اس سے قرونِ وسطی کے مغربی علوم و فنون کو اسلامی علوم سے الگ کر کے صرف لاطینی سائنس کی کتابوں سے جوڑ کر بیان کرنے کی لغویت کا اظہار ہوتا ہے۔ صدیوں تک تو یہاں لاطینی سائنسی کتابوں کی بمشکل ہی کوئی اہمیت تھی۔ وہ پرانی (بے وقعت) اور بے نام تھیں۔ جبکہ عربی سائنسی علوم کے اظہار کی اعلیٰ درجے کی حامل ایسی زبان تھی کہ نہ اس سے قبل (سوائے یونانی کے) کوئی زبان اس کے ہم پلہ نہ ہو سکی اور نہ ہی بعد میں۔ یہ صرف چند لوگوں، ایک قوم یا ایک عقیدہ کی زبان نہ تھی بلکہ یہ کئی لوگوں، کئی قوموں اور کئی عقیدوں کی زبان تھی۔

The best Arabic scientists were not satisfied with the Greek and Hindu science which they inherited. They admired and respected the treasures which had fallen into their hands, but they were just as "modern" and greedy as we are, and wanted more. They criticized EUCLID, APOLLONIOS and ARCHIMEDES, discussed PTOLEMY, tried to improve the astronomical tables and to get rid of the causes of error lurking in the accepted theories. They facilitated the evolution of algebra and trigonometry and prepared the way for the European algebraists of the sixteenth century.[23]

بہترین عرب سائنسدان اس یونانی اور ہندی علم سے مطمئن نہ تھے جو انہیں ورثہ میں ملا۔ انہوں نے اس علمی خزانے کی تعریف اور توقیر کی مگر وہ اس پر انحصار کرنے میں ہماری طرح جدید اور حریص تھے کہ اس میں مزید اضافہ کریں۔ انہوں نے اقلیدس، اپولونئس اور ارشمیدس پر تنقید کی اور بطلیموس پر بھی بحث کی، فلکیاتی جداول کو ترقی دی اور مقبول نظریات میں اغلاط اور تسامحات دور کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے الجبرا اور تکونیات کو ترقی دی۔ اور یورپ کی سولہویں صدی کے ماہرین الجبرا کے لئے راہیں ہموار کیں۔

مسلمانوں نے جس تمدن کی بنیاد رکھی وہ علم و حکمت، عدل و انصاف اور انسانیت نوازی پر استوار تھا۔ مسلمانوں کے دور عروج میں عدل اور انصاف کا معیار کیا تھا، اس کا اندازہ حضرت عمر بن عبد العزیز کے دور حکمرانی کے ایک واقعے سے ہوتا ہے۔ ثمرقند کی فتح کے بعد وہاں سے طویل سفر طے کر کے آنے والا ایک قاصد، سلطنت اسلامیہ کے حکمران "عمر بن عبد العزیز" سے ملنے کے لیے دارالخلافہ پہنچا۔ اس کے پاس ایک خط تھا جس میں وہاں کے غیر مسلم پادری نے مسلمان سپہ سالار قتیبہ بن مسلم کی شکایت کی تھی۔ پادری نے خط میں لکھا:

ہم نے سنا تھا کہ مسلمان جنگ اور حملے سے پہلے قبول اسلام کی دعوت دیتے ہیں۔ اگر دعوت قبول نہ کی جائے تو جزیہ دینے کا مطالبہ کرتے ہیں اور اگر کوئی ان دونوں شرائط کو قبول کرنے سے انکار کرے تو جنگ کے لئے تیار ہو جاتے ہیں. مگر ہمارے ساتھ ایسا نہیں کیا گیا اور ہم پر راتوں رات اچانک حملہ کر کے ہمیں مفتوح کر لیا گیا ہے۔

یہ خط ثمر قند کے سب سے بڑے پادری نے سلطنت اسلامیہ کے فرماں روا عمر بن عبد العزیز کے نام لکھا تھا۔ دمشق کے لوگوں سے شہنشاہ وقت کی قیام گاہ کا معلوم کرتے کرتے وہ قاصد ایک ایسے گھر جا پہنچا کہ جو انتہائی معمولی اور خستہ حالت میں تھا۔ ایک شخص دیوار سے لگی سیڑھی پر چڑھ کر چھت کی لپائی کر رہا تھا اور نیچے کھڑی ایک عورت گارا اُٹھا کر اُسے دے رہی تھی۔ جس راستے سے آیا تھا واپس اُسی راستے سے اُن لوگوں کے پاس جا پہنچا جنہوں نے اُسے راستہ بتایا تھا۔

اُس نے لوگوں سے کہا میں نے تم سے اسلامی سلطنت کے بادشاہ کا پتہ پوچھا تھا نہ کہ اِس مفلوک الحال شخص کا جس کے گھر کی چھت بھی ٹوٹی ہوئی ہے۔

لوگوں نے کہا: "ہم نے تجھے پتہ ٹھیک ہی بتایا تھا، وہی حاکم وقت عمر بن عبد العزیز کا گھر ہے۔" قاصد پر مایوسی چھا گئی اور بے دلی سے دوبارہ اُسی گھر پر جا کر دستک دی، جو شخص کچھ دیر پہلے تک لپائی کر رہا تھا وہی اندر سے نمودار ہوا۔ قاصد نے اپنا تعارف کرایا اور خط عمر بن عبد العزیز کو دے دیا۔

عمر بن عبد العزیز نے خط پڑھ کر اُسی خط کی پشت پر لکھا:

عمر بن عبد العزیز کی طرف سے سمرقند میں تعینات اپنے عامل کے نام: "ایک قاضی کا تقرر کرو، جو پادری کی شکایت سنے۔" مہر لگا کر خط واپس قاصد کو دے دیا۔

سمرقند لوٹ کر قاصد نے خط کا جواب اور ملاقات کا احوال جب پادری کو سنایا، تو پادری پر بھی مایوسی چھا گئی۔ اس نے سوچا کہ کیا یہ وہ خط ہے جو مسلمانوں کے اُس عظیم لشکر کو ہمارے شہر سے نکالے گا؟ اُنہیں یقین تھا کاغذ کا یہ ٹکڑا اُنہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے گا۔

مگر کوئی اور راستہ بھی نہ تھا چنانچہ خط لے کر ڈرتے ڈرتے امیر لشکر اور حاکم ثمرقند قتیبہ بن مسلم کے پاس پہنچے۔ قتیبہ نے خط پڑھتے ہی فوراً ایک قاضی کا تعین کر دیا جو اس کے اپنے خلاف سمرقندیوں کی شکایت سن سکے۔

قاضی نے پادری سے پوچھا، تمہارا کیا دعویٰ ہے؟ پادری نے کہا: قتیبہ نے بغیر کسی پیشگی اطلاع کے ہم پر حملہ کیا، نہ تو اِس نے ہمیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی اور نہ ہی ہمیں کسی سوچ و بچار کا موقع دیا تھا۔

قاضی نے قتیبہ کو دیکھ کر پوچھا، کیا کہتے ہو تم اس دعویٰ کے جواب میں؟

قتیبہ نے کہا: قاضی صاحب، جنگ تو ہوتی ہی فریب اور دھوکہ ہے۔

سمرقند ایک عظیم ملک تھا، اس کے قرب وجوار کے کمتر ملکوں نے نہ تو ہماری کسی دعوت کو مان کر اسلام قبول کیا تھا اور نہ ہی جزیہ دینے پر تیار ہوئے تھے، بلکہ ہمارے مقابلے میں جنگ کو ترجیح دی تھی۔

سمرقند کی زمینیں تو اور بھی سرسبز و شاداب اور زور آور تھیں، ہمیں پورا یقین تھا کہ یہ لوگ بھی لڑنے کو ہی ترجیح دیں گے، ہم نے موقع سے فائدہ اُٹھایا اور سمرقند پر قبضہ کر لیا۔

قاضی نے قتیبہ کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے دوبارہ پوچھا: قتیبہ میری بات کا جواب دو، تم نے ان لوگوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت، جزیہ یا پھر جنگ کی خبر دی تھی؟

قتیبہ نے کہا: نہیں قاضی صاحب، میں نے جس طرح پہلے ہی عرض کر دیا ہے کہ ہم نے موقع سے فائدہ اُٹھایا تھا۔

قاضی نے کہا: میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اپنی غلطی کا اقرار کر رہے ہو، اس کے بعد تو عدالت کا کوئی اور کام رہ ہی نہیں جاتا۔

اللہ نے اس دین کو فتح اور عظمت تو دی ہی عدل و انصاف کی وجہ سے ہے نہ کہ دھوکہ دہی اور موقع پرستی سے۔

میری عدالت یہ فیصلہ سناتی ہے کہ تمام مسلمان فوجی اور ان کے عہدہ داران مع اپنے بیوی بچوں کے، اپنی ہر قسم کی املاک اور مال غنیمت چھوڑ کر سمرقند کی حدوں سے باہر نکل جائیں اور سمرقند میں کوئی مسلمان باقی نہ رہنے پائے۔

اگر ادھر دوبارہ آنا بھی ہو تو بغیر کسی پیشگی اطلاع و دعوت کے اور تین دن کی سوچ و بچار کی مہلت دیئے بغیر نہ آیا جائے۔

پادری جو کچھ دیکھ اور سن رہا تھا وہ ناقابل یقین تھا۔ چند گھنٹوں کے اندر ہی مسلمانوں کا عظیم لشکر قافلہ در قافلہ شہر کو چھوڑ کے جا چکا تھا۔

ثمرقندیوں نے اپنی تاریخ میں ایسا کبھی نہیں دیکھا تھا کہ جب طاقتور فاتح قوم کمزور مفتوح قوم کو یوں دوبارہ آزادی بخش دے۔

ڈھلتے سورج کی روشنی میں لوگ ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے لگے کہ یہ کیسا مذہب اور کیسے پیروکار ہیں۔ عدل کا یہ معیار کہ اپنوں کے خلاف ہی فیصلہ دے دیں۔ اور طاقتور سپہ سالار اس فیصلہ پہ سر جھکا کر عمل بھی کر دے۔

تاریخ گواہ ہے کہ تھوڑی ہی دیر میں پادری کی قیادت میں تمام شہر کے لوگ گھروں سے نکل کر لشکر کے پیچھے سرحدوں کی طرف دوڑے اور لا الہ الاّ اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار کرتے ہوئے اُن کو واپس لے آئے کہ یہ آپ کی سلطنت ہے اور ہم آپ کی رعایا بن کر رہنا اپنے لئے فخر سمجھیں گے۔ اسلام نے وہاں ایسے نقوش چھوڑے کہ سمرقند ایک عرصہ تک مسلمانوں کا دارالخلافہ بنا رہا۔[۲۴]

۴۔ الفقر فخری

یہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کی جانب اشارہ ہے کہ "فقر میرے لیے باعث فخر ہے"[۲۵]۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقراء کی رفاقت کو اغنیاء کی مجلس سے زیادہ پسند فرماتے تھے اور انہیں کے حلقے میں زندہ رہنے اور انہیں کے گروہ میں وفات پانے کی دعا بھی فرمائی۔

علامہ اقبال کی فکر میں فقر کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ علامہ اقبال جس مرد قلندر اور مرد مومن کا بار بار تذکرہ کرتے ہیں وہ فقر کے حامل کردار سے ہی تشکیل پاتا ہے۔ اگر علامہ اقبال نے نوجوانوں کے لیے شاہین کو آئیڈیل قرار دیا ہے تو اس کا سبب بھی یہی ہے کہ شاہین میں فقر کے بنیادی اوصاف پائے جاتے ہیں جن کا تذکرہ کرتے ہوئے علامہ اقبال نے مولوی ظفر احمد صدیقی کے نام مورخہ ۱۲/ دسمبر ۱۹۳۶ء کے خط میں لکھا:

> شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں، اس جانور میں اسلامی فقر کے تمام خصوصیات پائے جاتے ہیں۔(۱) خوددار اور غیرت مند ہے کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔(۲) بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا(۳) بلند پرواز ہے(۴) خلوت پسند ہے(۵) تیز نگاہ ہے۔[۲۶]

علامہ اقبال کی اپنی زندگی بھی فقر کے اسی تصور کی عکاس تھی یعنی علامہ اقبال کی فکر کی مقبولیت اس بات کی گواہ ہے کہ ان کی فکر ظاہری اسباب کے بجائے تائید خداوندی کے ذریعے مسلمانان برصغیر اور بعد ازاں ملت اسلامیہ میں قبول عام حاصل کر گئی۔ یہ بھی علامہ اقبال کا امتیاز ہے کہ ان کی فکر ان کی زندگی میں ہی حقیقت کا روپ دھارنا شروع ہو گئی تھی حتی کہ جن تصورات کی طرف علامہ اقبال نے اپنی زندگی میں اشارہ کیا تھا وہی تصورات بعد ازاں حقیقت بنے۔ انہوں نے اپنے کلام میں انہی شخصیات کو بطور نمونے کے پیش کیا جن میں فقر کا کوئی نہ کوئی وصف، پہلو یا خصوصیت موجود تھی تاریخ اسلام کو وہ شخصیات جو فقر سے کلیتاً دور تھیں انہیں علامہ نے بطور آئیڈیل کے پیش نہیں کیا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی اس فقر کا کامل نمونہ ہے جس پر آپ نے فخر کا اظہار فرمایا۔

اگر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دولت کی خواہش ہوتی تو اللہ تعالیٰ جبل احد کو بھی سونا بنا دیتا۔ حد یہ ہے کہ جب مدینہ منورہ کے گلی کوچوں میں مال غنیمت کے ڈھیر لگ گئے اور ہر چیز کی افراط تھی، تب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی شے کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا، اور نہ اسباب دنیوی کو اہمیت دی۔ ایک مرتبہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد نبوی کی چٹائی پر سوئے ہوئے تھے اور چٹائی جسد مبارک پر جابجا کھب گئی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور چٹائی کے نشان دیکھ کر بے اختیار رونے لگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت فرمایا: اے عمر! روتے کیوں ہو؟ فرمایا: حضور پر میرے ماں باپ قربان ہوں۔ قیصر و کسریٰ جیسے کافر اور فاسق و فاجر لوگ تو عالیشان محلات میں ریشم و کمخواب کے بستر پر سوئیں اور حضرت رحمۃ للعالمین ہو کر بھی چٹائی کے اس تکلیف دہ فرش پر۔ یہی چیز مجھے رونے پر مجبور کرتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: عمر! ان کا عیش و آرام بالکل عارضی اور وقتی ہے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ دار بقا میں دائمی اور ابدی نعمتیں عطا فرمانے والا ہے۔ ہم دائمی کو چھوڑ کر عارضی چیز میں کیوں محو ہوں، اور خسارے کا سودا کیوں کریں۔[۲۷]

بہر حال اس فقر کی شان یہ تھی کہ اپنے سامنے زر و سیم کے انبار دیکھ کر بھی فقر ہی رہا اور دنیوی جاہ و حشم کے متعلق حرص و آز کو دل میں مطلق جگہ نہ دی۔ چنانچہ ایک جگہ فرمایا کہ "ہم نبیوں کے گروہ کی یہ خصوصیت ہے کہ ہم نہ تو اپنے اجداد سے کسی قسم کی مالی وراثت پاتے ہیں اور نہ اپنی اولاد کے لیے یہ وراثت چھوڑتے ہیں"۔ اسی سے ثابت ہے کہ اس "فقر" کا نصب العین سرمایہ ہرگز نہیں تھا، بلکہ تبلیغ حق اور قیام حکومت الٰہیہ اس کا واحد مطمح نظر تھا۔ اس ضمن میں یہ نکتہ بھی یاد رہے کہ جو فقر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے باعث فخر تھا، وہ فقر مخلوق سے قطعی بے نیازی اور خالق کے حضور مکمل نیاز مندی کا مفہوم رکھتا ہے۔ حسب آیہ قرآنی:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ۔[۲۸]

اے انسانو! تم سب کے سب اللہ کے (دروازے پر) فقیر ہو (محتاج و نیاز مند ہو) اور اللہ تو تمام مخلوق سے بے نیاز ہے۔ قابل حمد و ستائش ہے۔[۲۹]

علامہ اقبال یہاں جس فقر کا ذکر کر رہے ہیں اس سے مراد محروم المعیشت ہونا، محتاج ہونا اور معاشی یا اقتصادی طور پر پسماندہ ہونا نہیں ہے بلکہ دنیا کے تمام تر وسائل کا حامل ہوتے ہوئے ان وسائل سے مستغنی ہونا، انہیں اپنے لیے باعث فخر نہ سمجھنا اور انہیں انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر

کے سراپا ایثار و استغنا اور توکل و رضا بننے کا نام ہے جیسا کہ علامہ اقبال نے مسلمان کے زوال کے اسباب بیان کرتے ہوئے فرمایا:

اگرچہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات
جو فقر سے ہے میسر، تونگری سے نہیں
اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور و غیور
قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں
سبب کچھ اور ہے، تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں
اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہوا
قلندری سے ہوا ہے، تونگری سے نہیں[۳۰]

۵۔ بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روے زیبارا

مسلمانوں کی عظمت اور ان کے کردار کے بے مثل ہونے کو بیان کرنے کے لیے علامہ اقبال نے حافظ شیرازی کے مصرعے کو وسیلہ بنایا ہے۔ یعنی علامہ اقبال اس حقیقت کو بیان کر رہے ہیں کہ ہمارے اجداد جن میں سرفہرست خلفائے راشدین ہیں، حکمران ہونے کے باوجود دنیاوی رعب و دبدبہ، سطوت و تمکنت اور رعب و جلال کے محتاج نہ تھے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ کردار اور عظمت کی اس بلندی پر فائز تھے کہ ان کی بلندی کردار کی وجہ سے دنیاوی مراتب و مناصب ان کے لیے وقار کا باعث نہ تھے بلکہ ان کی ہستیاں دنیاوی منصبوں کو وقار عطا کرتی تھیں۔ ان کے سراپا فقر ہونے کا بنیادی سبب ہی یہ تھا کہ ان کی ہستیاں دنیاوی مرتبوں اور منصبوں کی محتاج نہ تھیں کہ وہ اعتراف عظمت کے لیے ان دنیاوی سہاروں پر انحصار کرتے۔

حافظ شیرازی کا شعر یوں ہے:

ز عشق ناتمام ما جمال یار مُستَغنی است
بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روی زیبا را؟[۳۱]

''ہمارے ناتمام عشق سے جمال یار بے پرواہ ہے۔ آب و رنگ اور خال و خط کی روئے زیبا کو ضرورت نہیں۔''

میر ولی اللہ اس شعر کی شرح میں لکھتے ہیں:

''قدرتی حسن کے لیے مصنوعی سنگار کی ضرورت نہیں۔ اور نہ معشوق کو ہمارے نامکمل عشق کی پرواہ ہے۔ اس کا حسن ان تمام لوازمات سے بے پرواہ ہے ہم اسے چاہیں یا نہ۔ اس کے عاشق ہوں یا نہ ہوں۔ اس کے حسن کامل پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ سورۃ آل عمران میں ہے کہ وَمَن كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الْعَالمین[۳۲]۔ ایک اور جگہ فرمایا ہے کہ وَاِن تَكْفُرُوا فَاِنَّ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمَاوَاتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَكَانَ اللّٰہُ غنیًّا حَمِیدًا۔[۳۳]

مولانا روم فرماتے ہیں:

ذکر جسمانہ خیال ناقصست
وصف شاہانہ از آنہا خالصست[۳۴]
حمد تو نسبت بداں گر بہترست
لیک آں نسبت بحق ہم ابترست[۳۵]

مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حسن مطلق پر دلدادہ نہ ہو تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ جو چیز بذاتہ مکمل ہو اسے تصنع کی ضرورت نہیں۔ اس لیے ہم اگر اپنے معبود کی پرستش کرتے ہیں تو صرف اپنے فائدہ کے لیے۔ محبوب کو اس سے کچھ فائدہ نہیں۔ اور اگر ہم اپنی معبود کی پرستش نہ کریں تو اس کو کچھ نقصان نہیں۔ سورہ عنکبوت میں اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے: وَمَن جَاهدَ فَاِنّمَا یُجَاہِدُ لِنَفْسِہ اِنَّ اللہ لَغَنی عَن العَالمین[۳۶]۔

خدا در انتظار حمد ما نیست
محمد چشم بر راہ ثنا نیست[۳۷]

غلام رسول مہر اپنی تصنیف "مطالب بانگ درا" میں لکھتے ہیں:

سچ کہا حافظ نے کہ چہرہ حسین اور خوبصورت ہو تو وہ بناوٹی زیب و زینت اور سجاوٹ سے بے نیاز ہوتا ہے۔ خواجہ حافظ نے چار لفظ استعمال کیے۔ آب و رنگ و خال و خط۔ آب سے مراد ہے چہرہ خوب دھو کر صاف

کرنا۔ رنگ سے مراد ہے غازہ اور سرخی، خال سے مراد ہے چہرے پر تل بنانا، خط سے مراد ابرو کے مقام پر سیاہ لکیر کھینچنا ہے۔ یہ سب بناوٹ کی چیزیں ہیں۔ ذاتی حسن بناوٹ سے بے پرواہ ہوتا ہے۔[۳۸]

علامہ اقبال یہاں یہ فرمارہے ہیں کہ اے نوجواں مسلم! تیرے اجداد بناوٹی حسن کے محتاج نہ تھے۔ وہ احکام خداوند کی پابندی اور اسوہ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کی وجہ سے کردار کی اس بلندی پر فائز تھے کہ وہ خود دنیا کے بناوٹی حسن کو حقیقت میں بدلنے کا منہج دینے والے تھے۔

۶۔ علم کے موتی

یہ نکتہ علامہ اقبال کے ان موضوعات میں شامل ہے جس کا تذکرہ جب بھی چھڑے علامہ اقبال کو غم اور اندوہ کا شکار کر دیتا ہے یعنی مسلمان جس عظیم علمی ورثے کے مالک تھے علامہ اقبال کو اس پر بہت دکھ اور تاسف ہے کہ آج کی نوجوان نسل نہ صرف اس دولت سے محروم ہے بلکہ اسے احساس تک نہیں کہ اس کی یہ دولت اغیار لوٹ کر لے جا چکے ہیں۔ یورپ میں حصول علم کے دوران چونکہ علامہ اقبال نے بہت سے حقائق اپنی آنکھوں سے دیکھے، مغرب کی لائبریریوں اور کتب خانوں میں مسلمانوں کے علمی آثار کا خود مشاہدہ کیا اور اس حقیقت سے آگاہ ہوئے کہ مسلمانوں کے علمی ورثے سے مغرب کے اہل علم کس طرح استفادہ کر رہے ہیں۔ سو اپنی نظم اور نثر میں جہاں کہیں انہیں موقع ملا انہوں نے اپنی قوم کو اس حقیقت سے روشناس کرایا۔ یہاں بھی علامہ اقبال اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ جب میں اپنے آباء واجداد کے علمی ورثے کو اہل مغرب کے ہاں دیکھتا ہوں کہ وہ تو اس سے استفادہ کر رہے ہیں اور ہم نہ صرف ان سے محروم ہیں بلکہ ان سے دور ہیں تو یہ منظر میرے دل کو پارہ پارہ کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید یزدانی لکھتے ہیں:

> لیکن جب ہم یورپ میں علم کے موتی یعنی اپنے اسلاف کی کتابیں دیکھتے ہیں تو ہمارا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے، بڑا دکھ ہوتا ہے۔ آج سے تین چار صدیاں پہلے یورپ ازمنہ مظلمہ (Dark Ages) میں ڈوبا ہوا تھا، وہاں جہالت کا دور دورہ تھا لیکن پھر اہل یورپ ہم مسلمانوں کی عظیم کتب لے گئے۔ (انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی حکومت کے دوران ہمارے کتب خانے یورپ منتقل کر لیے تھے جن کی کثیر تعداد اب لندن کی "انڈیا آفس لائبریری" اور برٹش میوزیم میں محفوظ ہے)۔[۳۹]

اگر مغرب کی لائبریوں اور کتب خانوں میں موجود مسلمان اہل علم اور سائنسدانوں کے علمی اثرات اور تصانیف کا جائزہ لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ علم کے ہر شعبے میں مسلمانوں نے غیر معمولی کارنامے سرانجام دیئے اور وہی کارنامے بعد ازاں مغرب کی علمی ترقی کی بنیاد بنے۔

علم ہیئت و فلکیات کے میدان میں مسلمان سائنسدانوں کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ اُنہوں نے یونانی فلسفے کے گرداب میں پھنسے علم الہیئت کو صحیح معنوں میں سائنسی بنیادوں پر اُستوار کیا۔ مغربی زبانوں میں اَب بھی بے شمار اَجرام سماوِی کے نام عربی میں ہیں، کیونکہ وہ مسلم ماہرینِ فلکیات کی دریافت ہیں۔

عظیم مغربی مورخ فلپ ہٹی (Philip K. Hitti) لکھتا ہے:

> Not only are most of the star ....names in European languages of Arabic origins .... but a numbers of technical terms .... are likewise of Arabic etymology and testify to the rich legacy of Islam to Christian Europe.[40]

یورپ کی زبانوں میں نہ صرف بہت سے ستاروں کے نام عربی الاصل (عربی زبان سے نکلنے والے) ہیں بلکہ لاتعداد اِصطلاحات بھی داخل کی گئی ہیں جو یورپ پر اِسلام کی بھرپور وراثت کی مہرِ تصدیق ثبت کرتی ہیں۔"

مسلمانوں کی علم الفلکیات میں خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ول ڈیورانٹ (Will Durant) لکھتا ہے:

> .... The Caliph al-Mamun engaged a staff of astronomers to make observations and records, to test the findings of Ptolemy, and to study the spots on the sun. Taking for granted the sphericity of the earth, they measured a terrestrial degree by simultaneously taking the position of the sun from both Palmyra and the plain of Sinjar; their measurement gave 56.66 miles--half a mile more than our present calculation; and from their results they estimated the earth's circumference to approximate 20,000 miles.[41]

..... یہاں خلیفہ مامون نے ماہرین فلکیات کو متعین کیا کہ وہ تحقیق و تدوین کریں، بطلیموس کے نتائج کو پرکھیں اور سورج کے دھبوں کا مطالعہ کریں۔ زمین کو گول تصور کرتے ہوئے انہوں نے زمین کی گولائی کے درجے کی پیمائش ۵۶ء۶۶ میل بیان کی۔ اس کے لئے انہوں نے پالیمرا اور سنجر کے

میدان سے سورج کے مقام کا تعین کیا۔ ان کی پیائش ہماری موجودہ پیائش سے صرف نصف ایک میل زیادہ ہے۔ اپنے ان نتائج سے انہوں نے زمین کا محیط تقریباً بیس ہزار (۲۰۰۰۰) میل بیان کیا۔

اندلس کے عظیم مسلمان سائنس دان ابن رشد، جسے مغرب میں Averroes کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، نے سورج کی سطح کے دھبوں (sunspots) کو پہچانا۔ Gregorian کیلنڈر کی اِصلاحات 'عمر خیام' نے مرتب کیں۔ خلیفہ مامون الرشید کے زمانہ میں زمین کے محیط کی پیائشیں عمل میں آئیں، جن کے نتائج کی دُرستگی آج کے ماہرین کے لئے بھی حیران کن ہے۔ سورج اور چاند کی گردش، سورج گرہن، علم المیقات (timekeeping) اور بہت سے سیاروں کے بارے میں غیر معمولی سائنسی معلومات بھی البتانی اور البیرونی جیسے نامور مسلم سائنسدانوں نے فراہم کیں۔[۴۲]

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد سے انسانیت دور قدیم سے دور جدید میں داخل ہو گئی۔ قرآن حکیم اور سیرت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات سے تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ وہ علمی سفر شروع ہوا جس نے تسخیر کائنات کی راہیں ہموار کیں، جو مشاہدہ، تجزیہ اور تجربہ پر مبنی تھیں۔ مسلمانوں نے نہ صرف قدیم توہمات اور مفروضوں کی تاریکیوں کو حقیقت شناسی کی روشنی سے بدلا، بلکہ علوم کی دنیا میں وہ انکشافات کئے جن کی نظیر دور حاضر میں بھی ملنا مشکل ہے۔

سائنس کے میدان میں مسلمانوں کی کامیابیاں اپنی نظیر آپ ہیں۔ مسلمانوں کی کلی توجہ مشاہدہ اور تجربہ پر تھی۔ انہوں نے کبھی بھی اپنے اوپر توہمات پر مبنی انداز نظر طاری نہیں ہونے دیا۔ اس کا اندازہ مسلمانوں کے علمی سفر سے ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے علم کے ان اسرار کا انکشاف کیا جن کی پہلے کوئی بنیاد بھی موجود نہ تھی۔ مثلاً ریاضی میں ابوکامل نے چوتھے درجے کی مساواتوں کے حل کا نظام وضع کیا اور غیر متعین مساواتوں کے لئے ۲۶۷۶ حل پیش کئے۔ قاہرہ بیت الحکمت کے ابن یونس نے فلکیاتی مسائل کے حل کے لئے طویل ترین ضربوں کے سوالات کو آسان جمع تفریق میں بدل دیا۔ ابن یونس کے طریقہ حساب کو ڈنمارک کے ماہر فلکیات ٹائیکو براہی (Tycho Brahe) نے ۵۰۰ سال بعد استعمال کیا۔ ابن یونس نے Sine1o کی حقیقی قدر کو کروڑویں درجے تک معلوم کرنے کا طریقہ بھی دریافت کیا۔ طبیعیات میں 'مسئلہ ابن الہیثم' (Alhazen Problem) صدیوں تک یورپی اہل علم کا موضوع تحقیق رہا۔ سترہویں صدی میں کرسچن ہائجنس (Christian Huygens) اور آئزک بارو (Isaac Barow) نے اس میں خصوصی دلچسپی لی۔ راجر بیکن (Roger Bacon) اور کیپلر (Kepler) ابن

الہیثم سے براہ راست متاثر تھے۔ ابن الہیثم کے دیے ہوئے چوکور (Quadrangle) کے زاویوں کی پیمائش کے ضابطوں کو مغربی ماہر ریاضی لیمبرٹ (Lamber, J. H.) نے ۷۰۰ سال بعد سترہویں صدی میں استعمال کیا۔ ابن الہیثم کے شاگرد حسین ابن اسحاق کی تصنیف 'العشر مقالات فی العین' (Ten Treatises on Eye) مغرب میں صدیوں تک امراض چشم کی نصابی کتاب رہی۔ ابن رشد اور عبدالملک ابن ابوزہر نے صدیوں قبل اپنی تصانیف میں امراض نسواں (Gynecology) کو تفصیل سے بیان کیا۔[۴۳]

مغرب پر اسلام کے احسانات کا ذکر کرتے ہوئے واٹ (Watt M. Watt) لکھتا ہے:

A statistician has argued that the numbers of references in the standard early European works show conclusively that Arab influence was much greater than Greek.[44]

''ایک ماہر شماریات کے مطابق اعداد و شمار اس امر کی تائید کرتے ہیں کہ ابتدائی معیاری یورپی تصانیف میں موجود حوالہ جات کی تعداد یہ ظاہر کرتی ہے کہ یورپ پر یونان کی نسبت عربوں (اسلام) کا اثر بہت زیادہ ہے۔''

۷۔ غنی! روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

یہ غنی کاشمیری کا شعر ہے۔ اصل شعر یوں ہے:

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ روشن کرد نور دیدہ اش چشم زلیخا را[۴۵]

علامہ اقبال نے غنی کاشمیری کے اس شعر کے ذریعے اسلامی تہذیب اور مغرب کے باہمی تعلق کو یہاں بیان کیا ہے کہ کس طرح مغربی تہذیب اپنی تمام تر ترقی اور علمی پیشرفت کے لیے مسلم تہذیب کی مقروض اور رہین منت ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں کہ یہ تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ ہمارے آباء واجداد کی کاوشوں، علمی کارناموں اور تحقیق و جستجو کے نتیجے میں لکھے جانے والی کتب اور تصانیف سے مغرب تو اپنے شعور کو روشن کر رہا ہے لیکن خود مسلم دنیا اور آج کا مسلم نوجوان ان علمی ذخیروں سے فائدہ اٹھانے سے محروم ہے۔ علامہ اقبال آج کے مسلم نوجوان کو دعوت دے رہے ہیں کہ جس سرمہ نور افزا سے مغرب اپنے شعور کی آنکھیں روشن کر کے علم اور تحقیق کے ذریعے تسخیر کائنات کی منزلیں طے کر رہا ہے،

اپنے شعور کو آج کے مسلم نوجوان کو بھی اس سرمہ نور افزا سے روشن کرنا چاہیے اور دنیا کی امامت کے اس منصب کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جو ہمارے آباءواجداد کی میراث ہے۔

***

حوالہ جات وحواشی

۱۔ یزدانی، ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید، شرح بانگ درا (لغت و تشریح)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۳۱۵۔

۲۔ شیخ عطاءاللہ، اقبال نامہ مجموعہ مکاتیب اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۲۲۵ – ۲۲۷

۳۔ غلام رسول مہر، مطالب بانگ درا، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۲۲۹

۴۔ نسیم امروہی، سید قائم رضا، نسیم اللغات اردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، س ن، ص ۱۰۷

۵۔ یوسف سلیم چشتی، پروفیسر، شرح بانگ درا، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، ص ۳۳۸، ۳۴۲

6 Bronowski, Jacob, *The Ascent of Man*, Little, Brown and Company, Boston/Toronto, 1973, pp. 165-166

7 George Sarton, *A Guide to the History of Science: A First Guide for the Study of the History of Science, with Introductory Essays on Science and Tradition*, Waltham Mass, 1952, p. 31.

8 George Sarton, *A Guide to the History of Science: A First Guide for the Study of the History of Science, with Introductory Essays on Science and Tradition*, p. 32.

۹۔ علامہ اقبال نے درج ذیل اشعار میں "دارا" کی اصطلاح استعمال کی ہے:

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم

(علامہ اقبال، کلیات اقبال اردو، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۳۷۳)

عاشق عزلت ہے دل، نازاں ہوں اپنے گھر پہ میں

خندہ زن ہوں مسند دارا و اسکندر پہ میں

(کلیات اقبال اردو، ص۹۶)

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

(کلیات اقبال اردو، ص۳۹۰)

تاریخ کہہ رہی ہے کہ رومی کے سامنے
دعویٰ کیا جو پورس و دارا نے خام تھا

(کلیات اقبال اردو، ص۲۷۱)

۱۰۔ علامہ اقبال نے درج ذیل شعر میں "تاج سر دارا" کی اصطلاح استعمال کی ہے:

غیرت ہے بڑی چیز جہان تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاج سر دارا

(کلیات اقبال اردو، ص۷۱۳)

۱۱ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، زیر اہتمام دانش گاہ پنجاب، شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، طبع اول، ۱۹۷۲ء، ج ۹، ص۱۴۹۔

۱۲ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، زیر اہتمام دانش گاہ پنجاب، شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، طبع اول، ۱۹۷۲ء، ج ۹، ص۱۵۰۔

۱۳۔ یوسف سلیم چشتی، پروفیسر، شرح بانگ درا، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، ص۳۳۸ - ۳۳۹

۱۴۔ حضرت نسیم امروہی، فرہنگ اقبال، اظہار سنز لاہور، ۱۹۸۴ء، ص۳۳۸۔

۱۵ شبلی نعمانی، الفاروق، تاج کمپنی لمیٹڈ، کراچی، س ن، ص۱۵۴ تا ۱۵۵

۱۶ شبلی نعمانی، الفاروق، ص۱۷۴ تا ۱۷۵

17 Philip K. Hitti, History of the Arabs, p. 393.

18 Philip K. Hitti, History of the Arabs, p. 364.

19 Dr. Robert Briffault, Rational Evolution: The Making of Humanity, p. 190-191.

20 Joseph Schacht & C.E.Bosworth, The Legacy of Islam, p .426-427.

21 Will Durant, The Age of Faith, p. 236.

22 George Sarton, A Guide to the History of Science: A First Guide for the Study of the History of Science, with Introductory Essays on Science and Tradition, p. 28.

23 George Sarton, A Guide to the History of Science: A First Guide for the Study of the History of Science, with Introductory Essays on Science and Tradition, p. 28.

۲۴ ۔ عمرو اسماعیل محمد، عمر بن عبد العزیز—عدلہ وزھدہ وحکمتہ، وقالہ الصحافہ العربیہ، مصر، ۲۰۲۱ء، ص ۱۳۰ – ۱۳۳۔

۲۵ ۔ ابن حجر عسقلانی، التلخیص الحبیر، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ج ۳، ص ۲۴۱، حدیث نمبر ۱۴۱۶۔

۲۶ ۔ شیخ عطاء اللہ، اقبالنامہ: مجموعہ مکاتیب، مکتوب بنام مولوی ظفر احمد صدیقی، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۸ء، ص ۱۹۴۔

۲۷ ۔ صحیح بخاری، حدیث نمبر ۴۶۴۷

۲۸ ۔ الفاطر، ۳۵: ۱۵

۲۹ ۔ عبد الرحمٰن طارق بی۔ اے، اشارات اقبال، کتاب منزل، لاہور، ۱۹۴۸ء، ص ۹۰ – ۹۱۔

۳۰ ۔ علامہ اقبال، کلیات اقبال اردو، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۸ء، ص ۵۳۲۔

۳۱ ۔ حافظ شیرازی، خواجہ شمس الدین محمد، دیوان حافظ، بہ تصحیح و توضیح پرویز ناتل خانلری، تہران، چاپ اول، ۱۳۶۲ھ۔ش، غزل نمبر ۳، ص ۲۲۔

۳۲ ۔ آل عمران، ۳: ۹۷

۳۳ ۔ النساء، ۴: ۱۳۱

۳۴ ۔ مولانا روم، مثنوی معنوی، دفتر دوم، بخش ۳۴، بیت ۸۵۔

۳۵ ۔ مولانا روم، مثنوی معنوی، دفتر دوم، بخش ۳۷، بیت ۲۴۔

۳۶۔ العنکبوت،۲۹: ۶

۳۷۔ میر ولی اللہ، لسان الغیب یعنی اردو شرح دیوان حافظ مع مفصل سوانح عمری خاجہ حافظ، نول کشور پریس، بار سوم، ۱۹۲۳ء، ص ۵۷ – ۵۸۔

۳۸۔ غلام رسول مہر، مطالب بانگ درا، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، س ن، ص ۳۰۰۔

۳۹۔ یزدانی، ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید، شرح بانگ درا (لغت و تشریح)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۳۱۶ – ۳۱۷۔

40 Philip K. Hitti, History of the Arabs, pp. 568-573.

41 Will Durant, The Age of Faith, p. 242.

42 Howard R. Turner, Science in Medical Islam: An Illustrated Introduction, p. 66.

43 Michael J. O'Dowd, The History of Medication for Women, p. 113.

44 Watt M. Watt, The Influence of Islam on Medieval Europe, p. 67.

۴۵۔ غنی کاشمیری، دیوان غنی کاشمیری، بہ تصحیح و اہتمام کیسری داس سیٹھ سپرنٹنڈنٹ، لکھنو، منشی نول کشور پریس، س ن، ص ۷